اسلام کا قانون بین الممالک

تالیف:

مفتی عبید الرحمٰن صاحب، مردان

رئیس دارالافتاء والارشاد، مردان

مکتبہ دارالتقوی، مردان

۰۳۰۰-۹۳۲۶۱۰۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب: ۔۔۔۔۔اسلام کا قانون بین الممالک

مصنف:۔۔۔۔۔۔۔ مفتی عبید الرحمان، مردان

صفحات:۔۔۔۔۔۔۔۵۶

ناشر:۔۔۔۔۔۔۔۔۔مکتبہ دارالتقویٰ، مردان

ملنے کا پتہ: دارالافتاءوالارشاد، مردان:۰۳۰۰۹۳۲۶۱۰۱

فہرست مضامین

تمہید و مقدمہ ۶

اصولِ موضوعہ ۶

اہمیت وضرورت ۶

پہلا اصل: ۶

دوسرا اصل: ۷

تیسرا اصل: ۸

چوتھا اصل: ۸

باب اول: تعارفی امور ۱۰

باب اول: تعارفی امور ۱۱

ممالک کے تعلق کی بنیاد ۱۱

ملکی تعلقات کی نوعیت واہمیت ۱۱

ملکی تعلقات کے اصناف واقسام ۱۲

دائرہ کار ۱۳

سابقہ کام کا جائزہ ۱۳

باب دوم: بین الممالک تعلقات ۱۶

باب دوم: بین الممالک تعلقات ۱۷

اجمالی وتمہیدی باتیں ۱۷

ایک سے زیادہ اسلامی ممالک کی شرعی حیثیت ۱۸

ایک ہی خلیفہ ضروری ہونے کی وجوہات ودلائل ۱۸

پہلی وجہ: نصوص ۱۸

دوسری وجہ: سلف کا تعامل ۲۲

تیسری وجہ: امت کا اتفاق واجماع	۲۳
اجماع کی اصل واساس	۲۶
تعدد والے قول کا پس منظر	۲۸
تطبیقی جائزہ	۲۹
"ملک" کی فقہی حیثیت وتکییف	۳۰
پہلی تکییف اور اس کا ثمرہ	۳۰
دوسری تکییف اور اس کا ثمرہ	۳۱
مسلم ممالک کا باہمی ربط وتعلق	۳۱
کفریہ ممالک کے ساتھ ربط وتعلق	۳۲
کفریہ ممالک کی قسمیں اور ان کے حکام	۳۲
محارب ملک اور اس کے ساتھ روابط کا حکم	۳۳
غیر محارب ممالک کے ساتھ تعلقات	۳۴
نصوص ودلائل	۳۵
پہلی نص	۳۵
طریقہ استدلال	۳۶
دوسری نص	۳۶
طریقہ استدلال	۳۸
تیسری نص	۳۹
ایک ضروری انتباہ	۴۰
جنگ وامن میں سے اصل کیا ہے؟	۴۱
اہل علم کا موقف	۴۱
دونوں موقف کا تجزیہ	۴۷

خلاصہ کلام ۴۹

باب سوم: عالمی اداروں کے ساتھ تعلقات ۵۰

باب سوم: عالمی اداروں کے ساتھ تعلقات ۵۱

اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنے کا مسئلہ ۵۱

عالمی اداروں کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم ۵۱

عالمی اداروں سے تعاون لینے کا حکم ۵۳

مراجع و مصادر ۵۶

تمہید و مقدمہ

اصولِ موضوعہ

اہمیت وضرورت

زیر بحث موضوع اگر ایک لحاظ سے غیر معمولی اہمیت اور حساسیت کا حامل ہے تو ساتھ دوسرے اعتبار سے مؤثر اور نتیجہ خیز بھی بہت ہے، پرانے دور کی بنسبت اس دور کی حکومتوں اور ان کے باہم ربط و تعلق کی شکلوں میں بھی غیر معمولی تفاوت پیدا ہو چکا ہے، ان جیسی متعدد اسباب وعناصر کی وجہ سے زیر بحث موضوع سے متعلق مسائل میں آراء وافکار کا اختلاف بھی سامنے آیا ہے، اس لئے شرعی نقطہ نظر سے بحث کرنے کے لئے چند اصول وضوابط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان کے بغیر درست نتیجے تک رسائی یقینی نہیں ہے، وہ اصول یہاں ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

پہلا اصل:

کسی شرعی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے دو طریقے ہیں:

ا: اجتہادی طریقہ کار: اس میں براہ راست قرآن وسنت کے نصوص سے استدلال کیا جاتا ہے، اجماع اور قیاس کی طرف بھی جایا جاتا ہے لیکن قیاس میں اپنے ہی اجتہاد سے علت کا استخراج واستنباط کیا جاتا ہے اور پھر خود ہی تحقیق وتطبیق کے مراحل سے اس کو گزارا جاتا ہے۔ اس طریقے پر گفتگو کرنے کا حق اسی شخص کو حاصل ہے جو اجتہادی ذوق اور اس کے لئے درکار علوم وآلات کا حامل ہو۔ اس طرز کے ساتھ جو تحقیق کی جاتی ہے وہ ہر شخص کے لئے تسلیم کرنا اور اسی کے مطابق عمل درآمد کرنا ضروری نہیں ہوتا، چنانچہ یہ بات طے شدہ

ہے کہ ہر مجتہد کی تقلید ہر شخص پر لازم نہیں ہوتی، تاہم اگر کوئی شخص یا جماعت کسی خاص مجتہد کی تقلید کرنے کا التزام کرلے تو دوسری بات ہے۔

۲: تقلیدی طریقہ کار: اس میں براہ راست قرآن وسنت سے استدلال کیا جاتا ہے اور نہ ہی از خود قیاس واستنباط کرنے کی جسارت کی جاتی ہے بلکہ کسی مسلم مجتہد / فقہی مذہب کی تحقیقات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ان تمام افراد کے لئے ہے جو اجتہادی ذوق کے حامل نہیں ہوتے یا اس کے لئے درکار صلاحیت واستعداد میں کوئی تشنگی رہتی ہے۔ اس طرز کی تحقیق کا عام افراد کے لحاظ سے حکم یہ ہوتا ہے کہ یہ تحقیق اصول مذہب کے دائرہ کے اندر ہو تو جس شخص نے اس مذہب کی تقلید کا التزام کر رکھا ہوتا ہے، اس پر اس کی تقلید کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

دوسرا اصل:

اسلامی تاریخ، مسلمان خلفاء وحکمران وغیرہ کے اعمال وافعال سے استدلال کرنے میں صرف ان کے اقدام کو دیکھنا کافی نہیں ہوتا بلکہ جس طرح دیگر چیزوں سے استدلال کرنے میں "اصول استدلال" کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور ان کی رعایت رکھے بغیر استدلال نتیجہ خیز نہیں ہوتا، یوں ہی ان جیسے واقعات سے بھی استدلال کرنے میں "اصول استدلال" کی پوری پابندی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ضابطہ یہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدین اور خلافت راشدہ کے علاوہ حکمرانوں اور حکومتوں کے اقدامات شرعی حجت نہیں ہیں، اسی طرح کوئی خلیفہ یا حکومت کوئی اقدام کرے تو اس سے استدلال کرتے ہوئے پورے پس منظر کو دیکھنا اور پھر موجودہ حالات کے مطابق اس کو پرکھ کر دیکھنا ضروری ہے، یوں ہی عمل سے زیادہ سے زیادہ جواز واباحت ہی پر استدلال کیا جاسکتا ہے، وجوب اور ضرورت اس سے ثابت نہیں ہوتی، چنانچہ خود "افعال رسول ﷺ" کی اصولی بحث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ ﷺ کے نفس عمل سے کسی بات کا وجوب ثابت نہیں ہوتا، تو دوسرے لوگوں کے اعمال وافعال کا کیا مقام ہے! غرض یہ ہے

کہ حکومتوں کے اقدامات سے استدلال کرنے میں "اصول استدلال" کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔

تیسرا اصل:

اگر کسی مسئلہ کی واقعی شرعی تحقیق مطلوب ہو تو اس کا مناسب اور معقول و متوازن طریقہ یہ ہے کہ خالی الذہن ہو کر تحقیق کی جائے، اگر مجتہد ہے تو اجتہادی طریقہ کے مطابق تحقیق کرے اور اگر مقلد ہے تو اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے تحقیق کرے، یہ طریقہ کار کسی طرح درست نہیں ہے کہ پہلے سے کوئی مفروضہ ذہن میں رکھا اور پھر اس کو شرعی لباس پہنانے کے لئے شرعی دلائل کا سہارا لیا جائے۔

ایسا کرنا "قلب موضوع" کے مترادف ہے کہ "شرعی دلیل" کی حیثیت "دلیل" سے بدل کر "مدلول" کی بن جاتی ہے، اس کا عمومی منشا یہ ہوتا ہے کہ شرعی تعلیمات کو دل وجان سے واجب العمل یا قابل عمل نہیں سمجھا جاتا، غیر شرعی بنیادوں پر مفروضہ قائم کرنے کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نصوص کی حیثیت مرجع کی نہیں ہے۔ حضرات مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شرعی دلیل کے بغیر آیت کی پہلے سے کوئی تفسیر ذہن میں متعین کی جائے اور پھر اس کے لئے نصوص میں بنیاد تلاش کی جائے تو یہ "تفسیر بالرائے" کی واضح مذموم صورت ہے جس کا مذموم ہونا محتاج بیان نہیں ہے، شرعی مسائل واحکام پر بحث ومباحثہ کا بھی یہی حکم ہے۔

چوتھا اصل:

اسلام دین کامل ہے جو نئے مسائل وتعلیمات میں کسی دوسرے نظام ومذہب کا محتاج ہے اور نہ ہی اصطلاحات میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا قواعد عامہ وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے اصطلاحات کی چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے، مثال کے طور پر "انصاف"، "مساوات"، "امن" اور "فلاح وبہبود" وغیرہ مفاہیم واصطلاحات ہیں کہ ایک ان

کا شرعی مفہوم اور دائرہ کار ہے اور ایک عام عرفی مفہوم ومصداق۔ دونوں میں یکسانیت نہیں ہے بلکہ بعض بنیادی قسم کے فروق موجود ہیں، اب اگر یہ چیزیں شرعی دائرہ کار سے نکلتی ہیں تو خواہ اس کو عرف عام میں ہزار بار انصاف اور مساوات باور کرایا جائے لیکن وہ شرعاً مطلوب نہیں ہیں اور ان کو مطلوب سمجھ کر استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں ہو گا۔

باب اول: تعارفی امور

ممالک کے تعلق کی بنیاد

ملکی تعلقات کی نوعیت واہمیت

ملکی تعلقات کے اصناف واقسام

زیرِ بحث کتاب کا دائرہ کار

سابقہ کام کا جائزہ

باب اول: تعارفی امور

پس منظر واہمیت۔ تعارف و تحدید موضوع۔ سابقہ کام کا جائزہ۔ باعث تالیف۔

ممالک کے تعلق کی بنیاد

جس طرح انسان مدنی الطبع اور میل جول پسند واقع ہوا ہے، اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ اختلاط اس کی فطرت کا تقاضا اور اس کی گھٹی میں داخل ہے ،اس کے بغیر اس کی زندگی پائیدار وہموار نہیں ہوتی،یوں ہی اس زمانے میں قوموں اور ملکوں کا حال بھی ہے۔ اس وقت کوئی قوم / ملک ایسا نہیں جو دوسرے تمام اقوام و ممالک سے بالکل ہٹ کٹ کر کوئی قابل قدر زندگی گزار سکے، بلکہ اس وقت کرہ ارض پر جتنے بھی ممالک بستے ہیں وہ اپنی مختلف ضروریات وغیرہ کی تکمیل کے لئے دوسرے ممالک کے ساتھ کسی نہ کسی درجے میں ربط و تعلق رکھنے کو اپنی ضرورت و مجبوری خیال کرتے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

ملکی تعلقات کی نوعیت واہمیت

افراد کے مقابلے میں اقوام و ممالک کا تعلق کچھ زیادہ ہی قابل التفات اور لائق توجہ ہے، جس کی مختلف وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم وملک در حقیقت لاکھوں، کروڑوں افراد کے مجموعے ہی سے عبارت ہے، کسی قوم وملک کا ربط و تعلق اپنے تئیں کروڑوں لوگوں کے ربط و تعلق کو متضمن ہوتا ہے، اس لئے کروڑوں افراد کے تعلق کی حیثیت پر جس قدر التفات کرنا ضروری یا مناسب ہوتا ہے، اتنا ہی التفات کسی قوم وملک کے ربط و تعلق پر ضروری یا مناسب ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ افراد کی بنسبت قوموں اور ملکوں کا باہمی ربط

عام طور پر بڑا ہی پالیسی ساز اور مؤثر کن ہوتا ہے، یہ تعلق عام افراد کے باہمی تعلق کی طرح سادہ بے اثر یا محدود اثر کا حامل نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر اور پیش منظر میں بہت کچھ پنہاں ہوتا ہے۔

ملکی تعلقات کے اصناف واقسام

دو ممالک جب آپس میں ربط و تعلق کا رشتہ استوار کرتے ہیں تو اس کی مختلف اقسام ہو سکتی ہیں، کبھی یہ تعلق معاشی اور اقتصادی ہوتا ہے، جیسا کہ عام طور پر تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ مختلف چیزوں کے در آمدات اور بر آمدات کا تعلق ہے، کبھی سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے، کبھی مذہبی اساس پر اس کی عمارت استوار ہوتی ہے جیسا کہ مسلمان ممالک کا آپس میں ہونا چاہئے، کبھی تعلق کی بنیاد استعمار و سامراج ہوتا ہے جو مختلف عنوانات کے تحت چھوٹے موٹے ممالک کو زیر قبض و تصرف رکھ کر ان پر اپنا تسلط بر قرار رکھتے ہیں جیسا کہ اس وقت امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ وغیرہ مختلف ممالک کے ساتھ ایسا ہی تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں، اور کبھی اس کے علاوہ بنیادوں پر ربط قائم ہوتا ہے۔

یہ تو مختلف ممالک کے باہمی تعلق کا قضیہ ہے، اس کے علاوہ اس موضوع کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ اس وقت متعدد ایسے ادارے قائم ہیں جو عالمی حیثیت کے حامل ہیں، مختلف ممالک ان کے ساتھ ربط و تعلق رکھنا بھی ایک گونا مجبوری یا مصلحت خیال کرتے ہیں اور اس بنیاد پر ان کے ساتھ ضابطہ کے مطابق تعلقات رکھتے ہیں، یہ ادارے اگر چہ کسی ملک کے باشندے بناتے ہیں اور کسی نہ کسی ملک ہی کے آغوش میں ان کی نشو ونما ہوتی ہے، تاہم ان کی حیثیت صرف ملکی نہیں ہوتی بلکہ ان کا اپنے محلِ وقوع ملک کے ساتھ تعلق صرف جغرافیائی طور پر ملک کے ساتھ تعلق رہتا ہے، باقی عالمی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کی مثال خود اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں کی ہے۔

دائرہ کار

زیر بحث کتاب میں بنیادی طور پر دو موضوعات پر بحث کرنا مقصود ہے:

الف: ایک یہ ہے کہ ایک واقعی اسلامی ملک دیگر ممالک کے ساتھ کس نوعیت کا تعلق رکھ سکتا ہے؟ ممالک کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں: ایک وہ ممالک جن کو اسلامی ممالک کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کفریہ ممالک کی ہے، ان دو مختلف قسم کے ممالک کے ساتھ تعلقات رکھنے کی نوعیت کیا ہو گی؟ پھر جس طرح ممالک کی قسمیں ہیں، یوں ہی تعلقات کی بھی مختلف انواع ہیں، ان میں سے کس نوعیت کا تعلق رکھنا جائز ہے اور کس نوعیت کا مذموم و ممنوع؟

ب: اس بحث کا دوسرا ضروری عنوان عالمی نوعیت کے اداروں کے ساتھ تعلق رکھنا ہے۔

سابقہ کام کا جائزہ

قدیم ائمہ مجتہدین وفقہائے کرام اس موضوع کے مسائل کو عام طور پر "سِیر" کے عنوان سے ذکر فرماتے تھے، چاروں فقہی مذاہب میں اس موضوع پر سیر حاصل مواد ومباحث موجود ہیں، خاص کر فقہائے حنفیہ میں سے حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمہ اللہ نے تو اس موضوع پر بڑا بنیادی اور تفصیلی کام کیا ہے، ان کی کتاب "سیر صغیر" پھر "سیر کبیر" اور اس کی جو شرح امام شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے کی ہے، وہ اس موضوع کے لئے مصدر وماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ نے اگرچہ جزئیات کی شکل میں مسائل ذکر فرمائے ہیں جو بادی النظر میں اپنے وقت کے مخصوص حالات سے متعلق ہیں اور موجودہ زمانے سے بظاہر ان کی کوئی خاص مناسبت معلوم نہیں ہوتی لیکن امام سرخسی رحمہ اللہ کے قابلِ قدر "تعلیلی مزاج" نے ان جزئیات کو بڑی سادگی وروانی کے ساتھ کلیات کے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور ہر دور

کے لئے اس سے استفادہ کرنے کو سہل الحصول بنادیا ہے بلکہ بعض مباحث و مسائل میں تو ایسی تعبیرات اختیار فرمائی ہیں جو "سہل ممتنع" محسوس ہوتی ہیں۔

زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حالات اور عالمی منظرنامے میں بھی بہت کچھ تغیر واقع ہوتا رہا، معاصر حالات کو ماضی کے حالات واحوال کے ساتھ مقارنہ کرکے دیکھا جائے تو واضح تصادم اور کھلا تضاد محسوس ہوتا ہے، اس لئے ماضی قریب سے لے کر اب تک مختلف اہل فکر اور ارباب علم اس موضوع پر کام کرتے رہے ہیں، ان میں سے چند کتابیں اور مقالات، جو اس کام کے دوران اس ناکارہ کے مطالعہ میں رہی ہیں، درج ذیل ہیں:

١: العلاقات الدولیۃ فی الاسلام۔ علامہ شیخ ابی زہرۃ مرحوم

٢: العلاقات الدولیۃ فی الاسلام۔ علامہ شیخ وہبۃ الزحیلی مرحوم

٣: العلاقات الدولیۃ فی الاسلام۔ دکتور عثمان جمعہ ضمیریہ

٤: العلاقات الدولیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ۔ دکتور عباس شومان

٥: الجہاد والحقوق الدولیۃ العامۃ۔ شیخ ظافر القاسمی

٦: المنظمات الدولیۃ۔ جعفر عبد السلام

٧: اصول العلاقات الدولیۃ فی فقہ الامام محمد بن الحسن الشیبانی۔۔ دکتور عثمان جمعہ ضمیریہ

٨: جدید قانون بین الممالک۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم

٩: قانون بین الممالک کے اصول اور نظریں۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم

١٠: اسلام کا قانون بین الممالک۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب مرحوم

یوں تو یہ تمام کتابیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں، اخلاص اور تدیّن کے ساتھ جو کام بھی انجام دیا جائے وہ بڑی وقعت کا حامل اور پوری قدر دانی کا مستحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل

وکرم ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق اسی طرز عمل کو اپناتے ہیں[1]، تاہم اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ یہ موضوع بہت ہی حساس، نازک اور دوررس اثرات ونتائج کا حامل ہے جس کی وجہ سے اس میں تھوڑی سے غلطی بھی خطرناک اور بہت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے، دوسری طرف کئے ہوئے کام کا جائزہ لیا جائے تو جہاں شرعی نقطہ نظر سے اس پر گفتگو کی گئی ہے، وہاں عمومی طور پر بحث ومباحثہ کا نہج اور استدلال واستنباط کا اسلوب ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے اصولی طور پر اتفاق کرنا بھی مشکل ہے اوراس کے ساتھ اصل حقائق تک رسائی بھی مشکل ہوجاتی ہے ،موضوع سے متعلق کتابوں کی طرف مراجعت کرنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔اس کتابچے کو لکھنے کی اصل واساس یہی ہے۔

---

[1] اس بات کو مزاج کے خلاف ہونے کے باوجود اس لئے ذکر کی گیا ہے کہ آج کل عصری اداروں سے متعلق ہمارے بہت سی خواہوں کی جانب سے دینی مدارس کے فضلاء وعلماء کرام کے بارے میں یہ تاثر پھیلایا جارہاہے کہ وہ دین وعلم پر اجارہ داری کرتے ہیں۔ یہ ناکارہ اس کو اردو کی مشہور کہاوت "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کے قبیل سے خیال کرتا ہے، البتہ یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے اس خیال کا تعلق عصری اداروں کے تمام افراد کے ساتھ نہیں ہے کہ وہاں بھی بہت سے متصلب دین دار محققین ہیں۔

باب دوم: بین الممالک تعلقات

اجمالی و تمہیدی باتیں

ایک سے زیادہ اسلامی ممالک کی شرعی حیثیت

ایک ہی خلیفہ ضروری ہونے کی وجوہات و دلائل

اجماع کی اصل و اساس

خلفاء کے تعدد والے قول کا پس منظر

"ملک" کی فقہی حیثیت و تکییف

مسلم ممالک کا باہمی ربط و تعلق

کفریہ ممالک کے ساتھ ربط و تعلق

کفریہ ممالک کی قسمیں اور ان کے احکام

محارب ملک اور اس کے ساتھ روابط کا حکم

غیر محارب ممالک کے ساتھ تعلقات

جنگ و امن میں سے اصل کی تعیین اور اہل علم کا موقف

خلاصہ کلام

باب دوم: بین الممالک تعلقات

اجمالی و تمہیدی باتیں

اس وقت دنیا میں دو قسم کے ممالک ہیں، ایک قسم ان ممالک کی ہے جن کو "اسلامی ممالک" کہا جاتا ہے اور دوسری قسم میں وہ ممالک آتے ہیں جن کو "غیر اسلامی ممالک" سے تعبیر کیا جاتا ہے، "اسلامی" یا "غیر اسلامی ملک" کوئی واقعی فقہی اصطلاح نہیں ہے، اس لئے اس کو مناط احکام بنانا بھی بالکل مناسب نہیں ہے، بس ضابطہ کی بات یہی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ "اسلامی ممالک" میں سے جو ممالک ایسے ہیں جو فقہی نقطہ نظر سے "دار الاسلام" ہوں، ان کا آپس میں تعلق کی نوعیت معلوم کرنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا فیصلہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱: آیا "دار الاسلام" کہلانے والے علاقوں کا ایک ہی ملک کی لڑی میں پرونا ضروری ہے یا ایک سے زیادہ ممالک کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں؟ دنیا میں ایک ہی دار الاسلام ہو گا یا ایک سے زیادہ خود مختار "دار الاسلام" بھی پائے جاسکتے ہیں؟ اس کو یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ "دار الاسلام" میں توحّد ضروری ہے یا تعدّد بھی ہو سکتا ہے؟

۲: اس زمانے میں جس اجتماعی قوت و وحدت کو "ملک" یا اس کے مترادف الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت اور فقہی تکییف کیا ہے؟

ان باتوں کے تصفیہ سے ان علمی نوعیت کے غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو جائے گا جو اس موضوع پر لکھنے والے مختلف حضرات کو لاحق ہوئی ہیں، اور جن کی وجہ سے بہت سے حضرات

عام اہل علم سے متصادم موقف اپنایا۔ اس لئے ذیل میں دونوں باتوں کو ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک سے زیادہ اسلامی ممالک کی شرعی حیثیت

قرآن وسنت کی اصل تعلیم یہی ہے کہ ایک ہی دار الاسلام ہو، وہاں تمام مسلمان اپنی دینی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے رہیں، دین اسلام جغرافیاتی یا قومی دین ومذہب نہیں ہے جو کسی خاص علاقے یا قوم تک محدود اور اسی میں منحصر ہو بلکہ ایک عالمی، ابدی دین ہے جو اپنے اندر پوری انسانیت کے لئے ہدایت کا سامان وپیغام رکھتا ہے، لہٰذا اسلامی مملکت کا مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہونا اور ہر ہر حصہ کا الگ اور مستقل حیثیت سے کھڑا ہونا اسلام کا اصل تقاضا اور بنیادی تعلیم تو بالکل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ سراسر متصادم ہے۔

ایک ہی خلیفہ ضروری ہونے کی وجوہات ودلائل

اس بات کی متعدد وجوہات ہیں، جن کو یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلی وجہ: نصوص

پہلی وجہ تو وہ نصوص ہیں جن میں ایک ہی امام اور خلیفہ ہونے کی تاکید کی گئی ہے، مثال کے طور پر" صحیح مسلم "میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ، فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا»[1]

ترجمہ:"جب دو حاکموں کی بیعت کی جائے تو جس کی بیعت آخر میں لی گئی ہے، اسے قتل کرو"۔

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الإمارة، باب إذا بويع لخليفتين، ج:۳، ص:۱۴۸۰۔

یہی، امام مسلم رحمہ اللہ ہی اپنی سند کے ساتھ حضرت عرفجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّهُ سَتَكُونُ هَنَاتٌ وَهَنَاتٌ، فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيعٌ، فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَنْ كَانَ»[1]

ترجمہ: "عنقریب مختلف وسوسے سامنے آئی گی، پس جو بھی اس امت کو متفرق کرنا چاہے، حالانکہ وہ متفق ہوں (کسی حاکم پر) تو جو بھی ہو اسے قتل کرو"۔

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَهَذَا أَدَلُّ دَلِيلٍ عَلَى مَنْعِ إِقَامَةِ إِمَامَيْنِ، وَلِأَنَّ ذَلِكَ يُؤَدِّي إِلَى النِّفَاقِ وَالْمُخَالَفَةِ وَالشِّقَاقِ وَحُدُوثِ الْفِتَنِ وَزَوَالِ النِّعَمِ[2]

ترجمہ: "یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ دو خلیفہ نہیں ہوسکتے، اس لئے کہ یہ نفاق، مخالفت، دشمنی، فتنوں اور نعمتوں کے زوال کا سبب ہے"۔

"صحیح بخاری" میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ» قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا؟

---

١ صحيح مسلم كتاب الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين وهو مجتمع، ج:٣، ص:١٤٧٩۔

٢ سورة البقرة الاية:٣٠، ج:١، ص:٢٧٣۔

قَالَ: «فُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، فَإِنَّ اللهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ»[1]

ترجمہ: بنی اسرائیل کی اقتدار انبیائے کرام کے ہاتھوں میں ہوتا، جب بھی کوئی نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی اس کا قائم مقام بنتا، اور چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے ،خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، صحابہ کرام نے پوچھا کہ آپ ہمیں کیا حکم دیں گے، فرمایا کہ "پہلے در پہلے خلیفہ کی بیعت میں رہو (یعنی جس کے ساتھ پہلے بیعت کی گئی وہی خلیفہ ہے) ان کو اپنا حق (اطاعت) دو، اور یقیناً ان کی رعایا کے بارے میں اللہ ان سے پوچھے گا۔ (یعنی آپ بہر حال اطاعت سے نہ نکلو)

اس روایت میں "فالاوّل" کا لفظ ہے جس میں "فاء" عربی زبان کے ضابطہ کے لحاظ سے "تعقیب مع الوصل" کے لئے آتی ہے، حاصل یہ ہوا کہ امت سب امراء کی ایک ساتھ طاعت نہ کریں بلکہ نمبروار اطاعت کرلیا کریں، پہلے جو شخص امارت کا منصب سنبھالے، اس کی اطاعت کریں، اس روایت کی تشریح میں حضرت امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ومعنىٰ هذا الحديث إذا بويع لخليفة بعد خليفة فبيعة الأول صحيحة يجب الوفاء بها وبيعة الثاني باطلة يحرم الوفاء بها ويحرم عليه طلبها وسواء عقدوا للثاني عالمين بعقد الأول جاهلين وسواء كانا في بلدين أو بلد أو أحدهما في بلد الإمام المنفصل والآخر في

---

١ شرح النووي علي صحيح مسلم، كتاب الأحاديث الأنبياء، بَابُ مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، ج:٤، ص:١٦٩۔

غيره هذا هو الصواب الذي عليه أصحابنا وجماهير العلماء وقيل تكون لمن عقدت له في بلد الإمام وقيل يقرع بينهم وهذان فاسدان[1]

ترجمہ: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک خلیفہ کے بعد دوسرے کی بیعت ہو جائے تو پہلے خلیفہ کی بیعت صحیح ہے، اس میں رہنا ضروری ہے، اور دوسرے کی بیعت باطل ہے، اس کی اطاعت کرنا حرام ہے، اور اس کے لئے بیعت لینا حرام ہے، خواہ لوگ دوسرے خلیفہ سے اس حال میں بیعت کرے کہ ان کو پہلے کی بیعت معلوم ہو یا نہ ہو، خواہ وہ دونوں خلیفہ دو جگہوں میں ہوں یا ایک جگہ میں، یا ایک معزول خلیفہ کی جگہ میں ہو اور دوسرا دوسری جگہ میں۔ یہی تفصیل صحیح ہے جو ہمارے مشایخ اور جمہور علمائے کرام کا مسلک ہے۔ اور بعض کے نزدیک بیعت اس خلیفہ کی معتبر ہے جو معزول خلیفہ کی جگہ میں ہو، اور بعض کے نزدیک دونوں میں قرع ڈالا جائے گا، لیکن یہ دونوں قول درست نہیں۔

علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ اسی کی شرح میں لکھتے ہیں:

قوْله: (بيعَة الأول فَالْأول) مَعْنَاهُ: إِذا بُويعَ لخليفة بعد خَليفَة فبيعة الأول صَحِيحَة يجب الْوَفَاء بهَا، وبيعة الثَّانِي بَاطِلَة يحرم الْوَفَاء بهَا سَوَاء عقدوا للثَّانِي عَالمين بِعقد الأول أَو جاهلين، وَسَوَاء كَانَا فِي بلدين أَو أَكثر، وَسَوَاء كَانَ أَحدهمَا فِي بلد الإِمَام الْمُنْفَصِل أم لَا، وَلم

---

١ شرح النووي على صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخليفة الأول فالأول، ج:١٢، ص:٢٣١۔

يبين حكم الثَّانِي فِي هَذَا، وَهُوَ مُبين فِي رِوَايَة أُخْرَىٰ: فاضربوا عُنُقه، وَفِي رِوَايَة أُخْرَىٰ: فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ كَائِنا من كَانَ.[1]

ترجمہ: "حدیث میں جو "بیعۃ الاول فالاول" کا لفظ آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ: جب ایک خلیفہ کے بعد دوسرے کی بیعت ہو جائے تو پہلے خلیفہ کی بیعت صحیح ہے، اس میں رہنا ضروری ہے، اور دوسرے کی بیعت باطل ہے، اس کی اطاعت کرنا حرام ہے، خواہ لوگ دوسرے خلیفہ سے اس حال میں بیعت کرے کہ ان کو پہلے کی بیعت معلوم ہو یا نہ ہو، خواہ وہ دونوں دو جگہوں میں ہوں یا دو سے زائد جگہوں میں ہوں، اور خواہ دونوں میں سے ایک معزول خلیفہ کی جگہ میں ہو یا نہ ہو، اور مذکورہ راویت میں دوسرے خلیفہ کا حکم نہیں بتلایا گیا، دراصل وہ دوسری روایت میں مذکور ہے کہ اس کا گردن مارو اور ایک روایت میں ہے کہ تلوار سے اس کو مارو جو بھی ہو"۔

دوسری وجہ: سلف کا تعامل

اسلامی ریاست کے ایک ہونے کی دوسری وجہ خود دور سلف کا تعامل ہے، حضور نبی اکرم ﷺ کے دور مبارک میں خلافت کا دائرہ اگرچہ محدود تھا، تاہم خلافت راشدہ کے آخر تک اس میں بہت کچھ وسعت آچکی تھی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں کم از کم دنیا کا ایک تہائی علاقہ خلافت کے زیر اثر تھا، اس زمانے میں ذرائع ابلاغ و مواصلات بھی بہت سادہ اور محدود قسم کے تھے، اس وقت ابلاغ و مواصلات کے جو ذرائع آسانی کے ساتھ دستیاب ہو جاتے ہیں، اُس دور میں ان کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے خلافت کے مرکز کو تقسیم نہ ہونے دیا، بلکہ پوری دنیا اسلام میں ایک ہی خلیفہ رہا، دو مستقل خلفاء کی انہوں نے عملی طور پر بالکل اجازت نہ دی، حالانکہ جس طرح اس زمانے میں دشمنان خلافت

---

۱ عمدة القاري، كتاب بدء الخلق، باب ما ذكر عن بني إسرائيل، ج:١٦، ص:٤٣۔

کی سازشوں، مخالفتوں اور اندرونی خلفشار کا عذر کیا جاتا ہے، پہلے زمانے میں بھی ایسے خطرات منڈلا رہے تھے۔

تیسری وجہ: امت کا اتفاق واجماع

تیسری بڑی بنیاد امت کے اہل علم وفضل کا اتفاق ہے، متعدد اہل علم نے اس بات پر کہ پوری دنیا میں ایک ہی خلیفہ کا ہونا ضروری ہے، اہل علم کا اتفاق بھی نقل فرمایا ہے، مثال کے طور پر امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واتفق العلماء على أنه لا يجوز أن يعقد لخليفتين في عصر واحد سواء اتسعت دار الإسلام أم لا وقال إمام الحرمين في كتابه الإرشاد ... وهو قول فاسد مخالف لما عليه السلف والخلف ولظواهر إطلاق الأحاديث [1]

ترجمہ: علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ ایک زمانے میں دو خلفاء کی بیعت کرنا درست نہیں، خواہ دار الاسلام وسیع ہو یا نہیں، امام حرمین اپنی کتاب "الارشاد" میں فرماتے ہیں کہ ۔۔۔ یہ قول فاسد ہے اور متقدمین اور متاخرین اور احادیث کے ظاہری عموم کا مخالف ہے۔

امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کی طرف منسوب کتاب "مقالات الاسلامیین" میں ہے:

واختلفوا هل يكون الإمام أكثر من واحد:فقال قائلون: لا يكون في وقت واحد أكثر من إمام واحد. وقال قائلون: يجوز أن يكون

---

١ شرح النووي على صحيح مسلم كتاب الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخليفة الأول فالأول، ج:١٢ ص:٢٣١۔

إمامان في وقت واحد أحدهما صامت والآخر ناطق فإذا مات الناطق خلفه الصامت، وهذا قول الرافضة، وجوز بعضهم ثلاثة أيمة في وقت واحد أحدهم صامت، وأنكر أكثرهم ذلك.[١]

ترجمہ: "علمائے کرام کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا خلیفہ ایک سے زائد ہوسکتے ہیں ؟بعض حضرات کے نزدیک ایک وقت میں ایک سے زائد حکمران نہیں ہوسکتے، جب کہ بعض دیگر کے نزدیک ایک وقت میں دو حکمران ہوسکتے ہیں، ان میں سے ایک بولنے والا اور دوسرا خاموش ہوگا، پھر جب بولنے والا مر جائے تو خاموش اس کا قائم مقام بن جائے گا، اور یہ روافض کا مسلک ہے، اور بعض روافض کے نزدیک خلفاء تین بھی ہوسکتے ہیں ان میں سے ایک خاموش ہوگا۔ لیکن جمہور روافض نے اس سے انکار کیا ہیں۔

دوسرے اور تیسرے قول کو روافض کی جانب منسوب کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ اہل سنت اور اہل حق پہلے ہی قول کے قائل ہیں۔

علامہ ابن حزم ظاہری مرحوم لکھتے ہیں:

وَاتَّفَقُوا انه لَا يجوز أَن يكون على الْمُسلمين فِي وَقت وَاحِد فِي جَمِيع الدُّنْيَا امامان لَا متفقان وَلَا مفترقان وَلَا فِي مكانين وَلَا فِي مَكَان وَاحِد[٢]

ترجمہ: علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ تمام دنیا میں مسلمانوں پر ایک وقت میں دو خلفاء نہیں ہوسکتے، خواہ متفق ہوں، یا مخالف، خواہ دو جگہوں میں ہوں یا ایک میں۔

---

١ مقالات الاسلاميين هذا ذكر اختلاف الناس في الدقيق، ص:٤٦٠۔

٢ مرلتب الإجماع ،الاملمة وَحرب أهل الرِّدَّة وَدفع الْمَرْء عَن نَفسه وَقطع الطَّرِيق، ص:١٢٤۔

علامہ ماوردی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وَإِذَا عُقِدَتِ الْإِمَامَةُ لِإِمَامَيْنِ فِي بَلَدَيْنِ لَمْ تَنْعَقِدْ إِمَامَتُهُمَا؛ لِأَنَّهُ لَا يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ لِلْأُمَّةِ إِمَامَانِ فِي وَقْتٍ وَاحِدٍ، وَإِنْ شَذَّ قَوْمٌ فَجَوَّزُوهُ.[1]

ترجمہ: "جب دو جگہوں میں دو مختلف حکمرانوں کے لئے بیعت لی جائے تو دونوں کی حکمرانی منعقد نہیں ہوگی، کیوں کہ ایک وقت میں امت مسلمہ کے دو حکمران نہیں ہوسکتے، اگرچہ ایک جماعت نے ایک الگ قول اختیار کرکے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

کرامیہ نے ایک وقت میں دو مستقل خلفاء کے درست ہونے پر اس بات سے استدلال کیا کہ جب ایک وقت میں دو انبیاء کرام (علیہم الصلاۃ والسلام) کی بعثت ممکن ہے اور اس سے نبوت میں فرق نہیں آتا تو پھر ایک وقت میں دوائمہ یاخلفاء کے درست ہونے سے کیامانع ہوسکتاہے! اس کی وجہ سے امامت وخلافت میں کیونکر فرق آسکتاہے؟ اس کاجواب دیتے ہوئے مفسر علامہ قرطبی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وَالْجَوَابُ أَنَّ ذَلِكَ جَائِزٌ لَوْلَا مَنْعُ الشَّرْعِ مِنْهُ، لِقَوْلِهِ: (فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا) وَلِأَنَّ الْأُمَّةَ عَلَيْهِ.

ترجمہ: "اگر شریعت مطہرہ یعنی نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی: "ان میں سے دوسرے کو قتل کرو" اورامت کا اجماع بیک وقت دوخلفاء کی موجودگی سے منع نہ کرتی تو (عقلا کوئی رکاوٹ نہ تھی اور) یہ معاملہ جائز ہوتا"

اس کے ایک آدھ سطر بعد تحریر فرماتے ہیں:

---

۱ الباب الأول في عقد الإمامة، صل: "في البيعة لخليفتين في وقت واحد"،ص:۲۹۔

. فَإِنْ قَالُوا: الْعَقْلُ لَا يُحِيلُ ذَلِكَ وَلَيْسَ فِي السَّمْعِ مَا يمنع منه. وقلنا: أَقْوَىٰ السَّمْعِ الْإِجْمَاعُ، وَقَدْ وُجِدَ عَلَىٰ الْمَنْعِ.[١]

ترجمہ: اگر یہ اعتراض کریں کہ عقل اسے محال نہیں سمجھتی، اور نقلا بھی ممانعت ثابت نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نقلی دلیل (موجود ہے اور نقلی دلائل) میں قوی دلیل اجماع ہے، اور اجماع اس کے ناجائز ہونے پر منعقد ہوئی ہے۔

اجماع کی اصل واساس

ان جیسے متعدد اہل علم نے اس باب میں اجماع واتفاق کا دعوی فرمایا ہے، کافی تلاش کے باوجود اس بات کا ٹھوس سراغ نہیں مل سکا کہ یہ اجماع واتفاق کس دور میں ہوا؟ لیکن موضوع پر غور وخوض کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر خود "سقیفہ بن ساعدہ" ہی میں اس پر حضرات صحابہ کرام کا اتفاق ہو گیا تھا، حضرات انصار (رضی اللہ عنہم) کی جانب سے جب یہ مطالبہ سامنے آیا کہ ایک امیر ہم میں سے مقرر ہو اور ایک مہاجرین میں سے ہو، تو اس کے جواب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

سَيْفَانِ فِي غَمْدٍ وَاحِدٍ ! إِذًا لَا يَصْلُحَانِ[٢]

ترجمہ: ایک کاش میں دو تلوار نہیں سماسکتے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسی سیاق میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اس دن لوگوں کو دیا تھا، اس میں فرمایا تھا:

١٦٦٢٨ :عن ابنِ إسحاقَ فى خُطبَةِ أبى بكرٍ -رضي الله عنه- يَومَئذٍ قال: وإِنَّه لا يَحِلُّ أن يَكونَ لِلمُسلِمينَ أميرانِ، فإِنَّه مَهما يَكُنْ

١ الجامع لاحكام القرن للقرطبي سورة البقرة،الأية:٣٠، ج١، ٢٧٤۔
٢ السنن الكبري للبيهقي،كتاب وفاة النبي صلى الله عليه وسلم ، كيف صلي على رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ج:٦، ص:٣٩٦۔

ذَلِكَ يَخْتَلِفُ أمرُهُم وأحكا مُهُم، وتَتَفَرَّقُ جَماعَتُهُم، ويَتَنازَعوا فيما بَينَهُم، هُنالِكَ تُترَكُ السُّنَّةُ وتَظهَرُ البِدعَةُ وتَعظُمُ الفِتنَةُ، ولَيسَ لأَحَدٍ عليٍّ ذَلِكَ صَلاحٌ[1].

ترجمہ: ابن اسحاق سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خطبے میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: مسلمانوں کے دو حکمران درست نہیں، کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو ان کے فیصلے مختلف ہوں گے اور ان کی جماعت منتشر ہو جائے گی اور آپس میں اختلاف کرنے لگیں گے، پھر سنت متروک ہو جائے گی اور بدعت پھیل جائے گی، اور فتنہ بڑ جائے گا، اور اس میں کسی کا فائدہ نہیں ہے۔

"سقیفہ بن ساعدہ" میں اس وقت اہل حل وعقد صحابہ کرام موجود تھے، آپ ﷺ کے اہل خانہ صحابہ کرام (رضوان اللہ عنہم) اگرچہ اس وقت اس مجلس میں موجود نہ تھے لیکن ان کو بھی اطلاع ہو گئی تھی اور اس کے باوجود ان کی طرف سے کسی طرح مخالفت سامنے نہیں آئی[2]۔

---

١ السنن الكبرى للبيهقي ت التركي، جماع أبواب الرعاة، باب لا يصلح إمامان في عصر واحد ،ج١٦ص ٥١٨

٢ یہ ناکارہ یہ تحریر لکھ چکا تھا، بعد میں علامہ وہبۃ الزحیلی رحمہ اللہ کی درج ذیل عبارت سامنے آئی جس سے اس بات کی پوری پوری تائید ہوتی ہے:

الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي ،ج:٨ص:٦٣٣٦۔

وأجمع الصحابة يوم السقيفة لانتخاب خليفة بعد النبي صلّى الله عليه وسلم على أنه لا يجوز إمامان في وقت واحد، بدليل ما أجاب به عمر بن الخطاب الحُبَاب بن المنذر الأنصاري رضي الله عنهما حينما قال: (منا أمير ومنكم أمير يا معشر قريش): فقال: (سيفان في غمد إذن لا يصلحان).

تعدد والے قول کا پس منظر

اس تفصیلی بحث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ:

۱: شرعی نقطہ سے ضروری ہے کہ ایک ہی مستقل خلیفہ اور ایک ہی خلافت ہو۔

۲: دو مستقل خلفاء و ممالک کا وجود شرعی تعلیمات سے متصادم ہے۔

۳: احادیث مبارکہ میں بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے، امت مرحومہ کا علمی اور عملی طور پر بھی اس پر اتفاق چلا آرہا ہے۔

جن اہل علم کی طرف اس کے خلاف اقوال کی نسبت کی جاتی ہے اور تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک وقت میں دو مستقل خلفاء اور دو مستقل اسلامی ممالک موجود ہو سکتے ہیں، ان کے نزدیک بھی اس کی اجازت مشروط ہے، چنانچہ ان کا بھی یہ موقف ہے کہ شریعت کا اصل متقضی یہی ہے کہ ایک ہی خلیفہ ہو اور پہلے شریعت کے اصل مقتضی پر ہی عمل کرنا ضروری ہے البتہ جہاں ایسا کرنا انتظامی لحاظ سے ناممکن یا ناقابل عمل ہو جائے، وہاں بقدرِ ضرورت تعدّد کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے، یعنی پہلے پہل تو اسی بات کا اہتمام ضروری ہے کہ پوری دنیا میں ایک ہی دار الاسلام ہو لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ایسا ممکن نہ رہے مثلاً دار الاسلام کا رقبہ بہت ہی زیادہ ہو جائے اور ایک جھنڈے تلے ان کو سنبھالنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ دو جگہ الگ الگ دار الاسلام بنے، مثال کے طور پر علامہ عبد القاہر بغدادی رحمہ اللہ، اہل سنت والجماعت کے اتفاقی مسائل کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

وَقَالُوا لَا تصلح الامامة الا لوَاحِد فِی جَمِیع ارْض الاسلام الا أَن یکون بَین الصقعین حاجز من بَحر أَو عَدو لَا یُطَاق وَلم یقدر أهل

كل وَاحِد من الصقعين علىٰ نصْرَة اهل الصقع الآخر فَحِينَئِذٍ يجوز لأهل صقع عقد الامامة لوَاحِد يصلح لَهَا مِنْهُم[1]

ترجمہ: فرمایا کہ اسلام کی تمام زمین میں امامت صرف ایک کے لئے منعقد ہو گی، البتہ اگر دونوں جانب کوئی رکاوٹ ہو، یعنی سمندر ہو یا کوئی ناقابل تسخیر دشمن ہو، اور دونوں جانب کے اہل اسلام ایک دوسرے کی مدد کرنے پر قادر نہ ہوں تو اس صورت میں ایک جانب کے لوگ اپنے میں سے کوئی باصلاحیت شخص حکمرانی کے لئے مقرر کر سکتا ہے۔

بہر حال، یہ دوئی صرف ظاہری اور انتظامی نوعیت کی ہو گی، جہاں تک حکومت وریاست کی بنیادی روح اور اس کے مقاصد واہداف کا تعلق ہے تو اس باب میں شرعی تعلیمات کی پابندی ایسی ہر حکومت کا بنیادی فریضہ اور اصل فرض منصبی ہے جو "اسلامی ریاست" یا "اسلامی مملکت" کہلانے کا دعوی کرتا ہو۔

تطبیقی جائزہ

یہ تو نظریاتی نوعیت کا جواب ہے، جہاں تک اس کی عملی تطبیق کا تعلق ہے تو سچی بات ہے کہ دور دراز اسلامی ممالک میں تو یہ عذر کچھ قابل سماع ہو سکتا ہے جہاں ایک ملک مشرق کے کنارے اور دوسرا مغرب کے اس پار ہو اور دونوں کے درمیان غیر اسلامی حکومتیں عارض ہوں جن کی وجہ سے دونوں ممالک کو ایک ہی دار الاسلام کی لڑی میں پرونا ممکن نہ ہو، لیکن قریب قریب ممالک میں ایسا کوئی معقول عذر موجود نہیں، بلکہ اہل فکر ونظر کا تجزیہ تو یہ ہے کہ امت مرحومہ کو اجتماعی سطح پر جن مشکلات ومصائب نے گھیراؤ میں لے رکھا ہے، ان کی بڑی

---

١ الْفَصْل الثَّالِث من فُصُول هَذَا الْبَاب فِي بَيَان الاصول الَّتِي اجْتمعت عَلَيْهَا اهل السّنة، ص: ٣٤١۔

وجہ یہی اسلامی ممالک کا تعدّد ہی ہے، یہ تعدّد ختم ہو جائے تو بہت سے گھمبیر مسائل خود بخود ختم ہو سکتے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ امت مرحومہ پچاس سے زیادہ ممالک میں بٹی ہوئی ہے، تقریباً ہر ملک اپنے آپ کو اسلامی ملک کہنے پر اصرار کرتا ہے لیکن سب ممالک کے نظریاتی اور عملی کردار و عمل میں بہت کچھ اساسی نوعیت کے فروق پائے جاتے ہیں، اس کے باوجود سب کو "اسلامی ممالک" ہی کہا جاتا ہے۔ ان ممالک کو الگ حیثیت دینے کی ضرورت تو درکنار، کوئی اجتماعی مصلحت بھی ظاہر نہیں ہے۔ یہ کتنے ہی خوش گوار حیرت کی بات یہ ہے کہ امریکہ، روس اور برطانیہ کے چھتری تلے تو دسیوں ممالک جمع ہو سکتے ہیں اور سب مل کر ایک اجتماعی ریاست قائم کر سکتے ہیں، ایسی ریاست بھی تشکیل دے سکتے ہیں جس میں بسا اوقات سورج ہی غروب نہیں ہوتا، لیکن ملت مرحومہ کے جزیرۃ العرب میں دسیوں ممالک ہیں جن میں سے بعض ممالک تو محض ایک صوبے کی حیثیت ہی رکھتے ہیں!

"ملک" کی فقہی حیثیت و تکییف

مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کے موضوع سے متعلق غلط فہمیوں کی دوسری بڑی بنیاد یہی معلوم ہوتی ہے کہ خود "ملک" کی فقہی حیثیت متعین نہیں کی جاتی، اس کی فقہی تکییف کئے بغیر ہی بحث شروع کی جاتی ہے، حالانکہ مناسب طریقہ یہی ہے کہ پہلے اس کی فقہی تکییف کی جائے، اس کے بعد ہی اس سے متعلقہ احکام پر بات کی جائے۔

ملک کی فقہی حیثیت میں درج ذیل احتمالات ہو سکتے ہیں:

پہلی تکییف اور اس کا ثمرہ

علامہ مصطفی زرقاء وغیرہ اہل علم کا موقف یہ تھا کہ معاصر قانون کی طرح شرعی نقطہ نظر سے بھی مختلف چیزوں کو شخصی قانونی کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے بلکہ عملی طور پر یہ حیثیت حاصل ہے، ان حضرات کی وساطت سے اس بحث کو فقہی مباحث میں فروغ ملا۔

بہر حال بہت سے معاصر اہل علم کے نزدیک شرعی نقطہ نظر سے بھی "شخص قانونی" کا یہ تصور درست اور معتبر ہے، حکومت وریاست کی فقہی حیثیت میں ایک احتمال یہی ہے کہ اس کو شخص قانونی قرار دیا جائے۔

فقہی لحاظ سے یہ تصور اور حیثیت درست ہے یا نہیں؟ اس سے قطع نظر کر کے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شخصِ قانونی خود تو معاملات انجام نہیں دے سکتا، معاملات کی انجام دہی کے لئے کسی کو وکیل مقرر کرے گا اور ظاہر ہے کہ وکیل وہی افراد ہوں گے جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ دوڑ معلوم ہوتی ہے، لہٰذا اگر وہ مسلمان ہوں تو ان کے ساتھ مختلف قسم کے معاملات کا حکم وہی ہو گا جو مسلمان کے ساتھ کرنے کا حکم ہے اور اگر وہ افراد اسلام کی نعمت وسعادت سے محروم اور کافر ہوں تو ان کے ساتھ تمام تر معاملات انجام دینے کا حکم وہی ہو گا جو کسی کافر کے ساتھ کرنے کا ہے۔

دوسری تکییف اور اس کا ثمرہ

دوسری ممکنہ تکییف یہ ہو سکتی ہے کہ باشندگانِ مملکت کی جانب سے اربابِ حکومت اور اصحابِ اقتدار کو وکیل فرض کر لیا جائے[1]، اس صورت میں بھی چونکہ عقد کے حقوق واحکام وکیل کی طرف راجع ہوتے ہیں، اس لئے ارباب اقتدار کی حالت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ مختلف قسم کے معاملات انجام دینے کا حکم کیا ہو گا؟

مسلم ممالک کا باہمی ربط وتعلق

"ملک" کی فقہی حیثیت واضح ہو جانے کے بعد مختلف ممالک کے آپس میں ربط وتعلق کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے، اس کی مختصر وضاحت یہ

---

[1] دونوں میں مآل کار فرق نہیں، بس پہلی تکییف میں قانون شخصی کا واسطہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور دوسری تکییف میں ایسا نہیں ہے۔

ہے کہ جس طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ دوستانہ بلکہ برادرانہ ربط و تعلق رکھ لینا چاہئے، ہر مسلمان کو دوسرے کے ساتھ نصیحت اور خیر خواہی کے ساتھ ہی پیش آنا چاہئے، کوئی مسلمان دوسرے کے ساتھ بلاوجہ بغض و نفرت رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کو ایذاء یا نقصان پہنچا سکتا ہے، یوں ہی دو مسلم ممالک کا بھی آپس میں ایسا ہی دوستانہ ربط و تعلق برقرار ہونا چاہئے، ہر کوئی دوسرے کے ساتھ خیر خواہانہ تعلق رکھے، ان میں سے کوئی دوسرے کے ساتھ بغض و عناد یا عداوت و دشمنی کا رویہ بالکل نہ رکھے، جس طرح ایک مسلمان فرد کو دوسرے مسلمان فرد کے ساتھ تعاون کرنے کی تعلیم و تلقین کی گئی ہے جبکہ وہ محتاج اور بے بس ہو بلکہ بعض اوقات یہ تعاون کرنا کسی حد تک ضروری اور واجب بھی بن جاتا ہے جس کا چھوڑنا گناہ و ممنوع ہے یوں ہی اگر کوئی مسلمان ملک کمروز و ضرورت مند ہو تو دوسرے مسلمان ملک کو اپنی استطاعت کی حد تک اس کے ساتھ احسان و تعاون کر لینا چاہئے، ضرورت کے موقع پر اس کو بے یار و مددگار چھوڑنا کسی طرح درست نہیں۔

کفریہ ممالک کے ساتھ ربط و تعلق

جس طرح فردی اور شخصی سطح پر کفار کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے کی بھی مختلف صورتیں اور متعدد شکلیں ہیں جن کے احکام یکساں نہیں، بلکہ خاصے مختلف ہیں، یوں ہی ملکی اور اجتماعی سطح پر بھی کفریہ ممالک کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے ساتھ ربط و تعلق رکھنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ یہاں ذیل میں اس کی بقدرِ ضرورت وضاحت کی جاتی ہے۔

کفریہ ممالک کی قسمیں اور ان کے حکام

کفریہ ممالک کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف: ایک قسم ان ممالک کی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہوں۔ ان ممالک کو یہاں "محارب ممالک" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

ب: دوسری قسم میں وہ ممالک آتے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ بر سرِ جنگ نہ ہوں ،ایسے ممالک کو یہاں "غیر محارب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

محارب ملک اور اس کے ساتھ روابط کا حکم

محارب ملک کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے عموماً مراد وہ ملک و قوم لی جاتی ہے جو مسلمان مخاطب یا متکلم کے قوم و ملک سے بر سرِ جنگ ہو، مثال کے طور پر پاکستان کے لوگ محارب اسی کو سمجھتے ہیں جو کافر ہو اور خود پاکستان کے ساتھ بر سر جنگ ہو حالانکہ یہ تصور بہت ہی ادھورا ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے "محارب" کے لفظ میں وہ سب غیر مسلم ممالک داخل ہیں جو دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں مصروف ہو یا خود ان کا قیام ہی مسلمانوں کی سر زمین پر غاصبانہ طور پر ہو، لہٰذا اس وقت امریکہ ،اسرائیل، فرانس اور روس وغیرہ محارب ممالک ہیں اور یہ صرف ان ممالک کے لئے محارب کی حیثیت نہیں رکھتیں جن کے ساتھ ان کی جنگ چل رہی ہے بلکہ دنیا جہان کے تمام مسلمانوں کے حق میں اس کی یہی حیثیت ہے، اسی طرح بھارت، سپین، اسرائیل کی حکومتیں ہی مسلمانوں کی سرزمین پر قائم واستوار ہے، یہ اور ان جیسے ممالک اگر عملی طور پر کسی مسلمان ملک کے خلاف جنگ میں مصروف نہ بھی ہوں تو بھی ان کی حیثیت محارب ممالک ہی کی سی ہے کیونکہ یہ تینوں ممالک ایسی سرزمین پر قائم ہیں جہاں صدیوں مسلمانوں کی حکومتیں رہی ہیں، پھر مسلمانوں کی غفلتوں اور دشمن کی عیاریوں وغیرہ عناصر کی بدولت یہ جگہیں غیر مسلم طاقتوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئیں اور ان کی عملداری شروع ہو گئی۔

جہاں تک ایسے محارب ملکوں کے ساتھ تعلقات رکھنے کا حکم ہے تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

الف: برادرانہ اور دوستانہ تعلق رکھنا تو کسی طرح جائز نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کے دسیوں نصوص میں اس کی مذمت و ممانعت فرمائی گئی ہے۔

ب:ان کی نصرت وتعاون کرنا بھی جائز نہیں، خاص کر جب وہ مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہو،ایسے موقع پر ان کے ساتھ فوجی تعاون کرنا تو ایسا کام ہے جو کسی مسلمان فرد / قوم / ملک سے متصور نہیں ہو سکتا، بہت سے اہل علم نے اس کو کافرانہ فعل کہا ہے۔

ج:ایسے ممالک، جو مسلمانوں سے غصب کی ہوئی زمین پر قائم ہے،ان کو "تسلیم کرنا" بھی ناجائز ہے، جس طرح غصب کرنا ناجائز اور حرام ہے،یوں ہی غاصبانہ قبضہ کو برقرار رکھنا بھی ناجائز اور حرام ہے،اوراس کی تائید کرنا بھی ناجائز وممنوع ہے،"تسلیم کرنا" بھی تائید کے مترادف ہے۔

د:اس وقت بین الاقوامی اور بین الممالک سطح پر دوطرفہ تعلقات کا رواج ہے، جن میں صرف ایک فریق ہی کا فائدہ نہیں ہوتا بلکہ دونوں فریق اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں،ایسے تعلقات کے سلسلے میں ضابطہ کی بات یہ ہے کہ محارب ملک کے فوائد کے پیش نظر تو ایسا کرنا بھی درست نہیں، اپنا فائدہ پیش نظر ہو تو بھی جہاں تک ہو سکے،اس سے رکنا ہی چاہئے اوران کے علاوہ دیگر ممالک سے اپنی ضرورتوں کی تکمیل کر لینی چاہئے۔

ر:ایسے ممالک کے ساتھ اصل تعلق جنگ وجہاد ہی کا ہے، البتہ اس کے لئے استطاعت شرط ہے۔

غیر محارب ممالک کے ساتھ تعلقات

وہ غیر مسلم ممالک جو اپنے اصل واساس کے لحاظ سے تو ہیں غیر مسلم اور کفریہ ،لیکن درج بالا مفہوم میں "محارب" نہ ہو،ان کے ساتھ تعلقات رکھنے کا بنیادی ضابطہ وہی ہے جو اس نوعیت کے کفار کے ساتھ تعلقات رکھنے کا ہے۔جو کافر مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ نہ ہو،ان کے ساتھ تعلقات رکھنے میں یہ تفصیل ہے کہ:

ا:دوستی ومحبت کا تعلق رکھنا تو بہرحال ناجائز ہے، مسلمان شخص کے لئے کافر کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھنا جائز نہیں۔

۲:دوستی ومحبت کے علاوہ حسب مصلحت ظاہری خوش خلقی کرنا، مدارات کرنا درست ہے، خاص کر اگر وہ اسلامی مملکت کا شہری بن کر رہنے کو ترجیح دیتا ہے تو ایسے کافر کی جان ومال کی حرمت شدید ہو جاتی ہے۔

یہ، غیر محارب افراد واشخاص کے ساتھ تعلق کرنے کا حکم ہے، غیر محارب ممالک کے ساتھ تعلق رکھنے کا بنیادی ضابطہ بھی یہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ممالک واقوام کا باہمی تعلق افراد کے باہمی تعلق کی طرح سادہ اور محدود نہیں ہوتا بلکہ دور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے، اس لئے شخصی تعلقات کی بنسبت ملکی تعلقات قائم کرنے میں خاصے احتیاط کی رعایت رکھنی ضروری ہے، یہاں کی تھوڑی سے غلطی بھی بسا اوقات بڑے ہی نقصان وخسارے کا باعث بن سکتی ہے۔

نصوص ودلائل

کفار کی ان مختلف اقسام کے احکام قرآن وسنت کے بیسیوں نصوص میں مختلف اسالیب کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں جس کی تفصیل اس ناکارہ کی کتاب "اسلام اور غیر مسلم تعلقات" میں ذکر کی گئی ہے، اس کی طرف مراجعت شاید مفید ثابت ہو گا ان شاء اللہ، یہاں بقدر ضرورت ایک دو نصوص کو ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی نص

سورۃ مائدہ میں ارشاد خداوندی ہے:

{ تَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ (٨٠) وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ} [المائدة: ٨٠، ٨١]

ترجمہ: "تو دیکھے گا تو ان میں سے بہت سے لوگ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں انہوں نے کیسا ہی برا سامان اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجا اور وہ یہ کہ ان پر اللہ کا غضب ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔ اور اگر وہ اللہ اور نبی پر اور اس چیز پر جو اس کی طرف سے نازل کی گئی ہے ایمان لاتے تو کافروں کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں"

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا اور سول پر سچے ایمان کا مقتضی یہی ہے کہ کفار کے ساتھ دوستانہ تعلق اور ولایت نہ رہے، ایسا کرنا باعث فسق اور موجب عذاب ہے۔

طریقہ استدلال

طریقہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے یہ مضمون ذکر فرمایا گیا کہ بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے شکار ہوئے، پھر ملعون ہونے کی وجوہات واسباب بیان فرمائے گئے جن میں ان کا "عصیان" اور "اعتداء" یعنی شرعی احکام کی نافرمانی اور بندگی کے حدود سے تجاوز کا ذکر ہے، اسی سیاق میں یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ کفار کے ساتھ "تولی" یعنی دوستانہ تعلق رکھتے ہیں، اس کے بعد اس فعل کی مذمت فرمائی گئی اور درج بالا آخری آیت میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا کہ اگر یہ لوگ خدا اور سول پر ایمان رکھتے تو کفار کے ساتھ ولایت کا تعلق نہ رکھتے لیکن ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں، یہ بات اصطلاحی لحاظ سے "شرط اور جزاء" کے قالب میں فرمائی گئی ہے جن کے درمیان تلازم ہوتا ہے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ ایمان کے ساتھ کفار کی دوستی جمع نہیں ہو سکتی، اگر ایمان کی دولت نصیب ہو تو کافروں کے ساتھ دوستی نبھانا ممکن نہیں، تاہم چونکہ ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں اس لئے ایمان تقاضوں کے خلاف کفار کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں۔

دوسری نص

سورۃ ممتحنہ میں ارشاد خداوندی ہے:

{قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللهِ مِنْ شَيْءٍ} [الممتحنة: ٤]

ترجمہ: "بیشک تمہارے لیے ابراہیم میں اچھا نمونہ ہے اور ان لوگوں میں جو اس کے ہمراہ تھے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا بیشک ہم تم سے بیزار ہیں اور ان سے جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو ہم نے تمہارا انکار کر دیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی اور بیر ہمیشہ کے لیے ظاہر ہو گیا یہاں تک کہ تم ایک اللہ پر ایمان لاؤ مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے کہنا کہ میں تمہارے لیے معافی مانگوں گا اور میں اللہ کی طرف سے تمہارے لیے کسی بات کا مالک بھی نہیں ہوں"

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ:

الف: کافر اور مسلمان کے درمیان محبت اور دوستی کا تعلق استوار نہیں ہوتا بلکہ بغض وعداوت کی فضاء قائم ہوتی ہے۔

ب: (دینی ضرورت یا مصلحت متقاضی ہو تو) اس بغض وعداوت کا اظہار کرنا بھی ضروری یا مناسب ہے۔

ج: کافر اور مسلمان کے درمیان اس بغض وعداوت کی انتہاء یہ ہے کہ کافر مسلمان ہو جائے، یعنی کافر جب تک کافر ہے تو اس کے اور مسلمان کے درمیان محبت اور مودت کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔

د: اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس باہمی اختلاف کی بنیاد خود کفر وایمان ہے، ملک وقوم وغیرہ کا اختلاف اس میں مؤثر نہیں۔

امام جصاص رازی رحمہ اللہ "سورۃ مائدۃ" کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

قوله تعالىٰ يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارىٰ أولياء بعضهم أولياء بعض .. وفي هذه الآية دلالة علىٰ أن الكافر لا يكون وليا للمسلم لا في التصرف ولا في النصرة ويدل علىٰ وجوب البراءة من الكفار والعداوة لهم لأن الولاية ضد العداوة فإذا أمرنا بمعاداة اليهود والنصارىٰ لكفرهم فغيرهم من الكفار بمنزلتهم ويدل علىٰ أن الكفر كله ملة واحدة لقوله تعالىٰ بعضهم أولياء بعض.[1]

ترجمہ: "اللہ تعالی کے اس ارشاد کہ: "ایمان والوں یہود ونصاری کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں" میں اس بات کی دلیل ہے کہ کافر مسلمان کا دوست نہیں ہوسکتا، نہ امور حکومت میں اور نہ مدد کرنے میں، اور اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ کافروں سے اظہار براءت اور دشمنی کرنا واجب ہے، اس لئے کہ دوستی دشمنی کی ضد ہے، پس جب ہمیں یہود اور نصاری سے ان کی کفر کی وجہ سے دشمنی کا حکم دیا گیا تو ان کے علاوہ کافر بھی ان کی طرح ہیں (ان سے دشمنی کرنے میں) اور اس بات کی دلیل کہ تمام کافر ایک ملت کے لوگ ہیں، اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ "وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں"۔

طریقہ استدلال

طریقہ استدلال واضح ہے کہ "شرائع سابقہ" کی بات جب بلا تردید قرآن وسنت میں ذکر ہو تو یوں ہی قابل استدلال ہوتی ہے، یہاں تو دوگنا تاکید کے ساتھ واضح الفاظ میں یہ اعلان

---

١ أحكام القرآن للجصاص ت قمحاوي ، سورة المائدة آية ٥١ ، ج٤ ص٩٩.

فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے اس قول میں تم لوگوں کے لئے بہتر نمونہ ہے جو دعوتِ عمل کے مترادف ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی جو بات نقل فرمائی گئی ہے اس میں نہ صرف کافروں کے کفریہ اقدام سے براءت کا اعلان ہے بلکہ ساتھ اس بات کا بھی تاکیدی اعلان واظہار ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض کی فضاء ہمیشہ کے لئے برقرار رہے گی جب تک تم لوگوں مسلمان نہ ہو جائیں، حالانکہ دیکھا جائے تو مخاطب قوم اس وقت حضرت ابراہیم علیہ الصّلاۃ والسلام
کے ساتھ برسرجنگ نہ تھی۔

تیسری نص

سورۃ ممتحنہ ہی میں ارشاد خداوندی ہے:

{لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (٨) إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ } [الممتحنة: ٨، ٩]

ترجمہ: " اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اس بات سے کہ تم ان سے بھلائی کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمہیں اللہ انہیں سے منع کرتا ہے کہ جو دین میں تم سے لڑے اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر (لوگوں کی) مدد بھی کی کہ ان سے دوستی کرو اور جس نے ان سے دوستی کی تو پھر وہی ظالم بھی ہیں"۔

اس آیتِ مبارکہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ کفار کی دو قسمیں ہیں:

الف: ایک قسم ان کفار کی ہے جو مسلمان کے خلاف جنگ کریں اور نہ ہی ان کو اپنے گھروں سے نکالیں، حکم یہ ہے کہ ایسے کفار کے ساتھ نیکی واحسان کرنا درست ہے[1]، شرعی لحاظ سے یہ ممنوع نہیں۔

ب: دوسری قسم میں وہ کفار داخل ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کیا ہوں، ان کو اپنے گھروں اور علاقوں سے باہر نکالا ہوں، یا اس میں دوسری طاقت کے ساتھ مدد و تعاون کیا ہوں۔ حکم یہ ہے کہ ایسے کفار کے ساتھ نیکی کا تعلق رکھنا جائز نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی صاف ممانعت ہے اور جو مسلمان بھی ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کا تعلق نبھائے گا وہ بڑا ہی ظالم ہے۔

ایک ضروری انتباہ

یاد رہے کہ یہاں لفظ "قاتلوکم" اور "اخرجوکم" میں میں جو جمع مذکر مخاطب کی "کم" ضمیر ہے، اس کے مخاطب مجموعی طور پر پوری امت ہے، کسی خاص ملک / علاقے / قوم کے مسلمان مراد نہیں، لہٰذا اگر کوئی کافر ملک ایسا ہے جو دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو، ان پر ظلم و ستم کرے تو پوری امت کے لئے ان کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھنے کی ممانعت ہے۔

قومی ریاستوں کے عام ہو جانے کی وجہ سے امت کو نظریاتی میدان میں جو متعدد نقصانات پہنچیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دینی احکام اور نصوص کی تعبیرات کو بھی ان قومی ریاستوں کے خول میں سمجھنا سمجھانا شروع ہوا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کو وہ حیثیت نہیں دیتے جو اپنے ملک کے مسلمانوں کے مظالم کو دیتے ہیں، ہر ملک کی خارجہ پالیسی اپنے ہی ملک کے مفادات

---

[1] البتہ نیکی واحسان کرنے اور محبت و دوستی رکھنے میں فرق ہے، تفصیل کے لئے اس ناکارہ کی کتاب "اسلام اور غیر مسلم تعلقات" ملاحظہ فرمائیں۔

کا تحفظ کرتی ہے اور اپنے ہی ملکی مفادات کے تحت پالیسی بناتی ہے، دوسرے مسلم ممالک کا کماحقہ کوئی پاس ولحاظ نہیں رکھتی، چنانچہ بہت سی مرتبہ یہ عجیب وغریب اور کڑوی حقیقت بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ ایک ملک مسلمانوں کے ایک حکومت کے خلاف برسرجنگ ہے، ان پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھارہاہے لیکن دوسری طرف متعدد "اسلامی ممالک" اس کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ امریکہ، روس، اسرائیل اور فرانس وغیرہ ممالک کے ساتھ مسلمان ممالک کے برتاؤ کا یہی حال ہے، واضح طور پر ایسا محسوس ہورہاہے کہ ملت کا غم ودرد مشترک نہیں ہے، اخوت کی اصل واساس بھی دینی واسلامی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک ریاست میں ہونا اصل بنیاد ہے جو قرآن وسنت کے واضح تعلیمات سے سراسر متصادم ہے۔

جنگ وامن میں سے اصل کیاہے؟

بین الممالک تعلقات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا بنیادی منشا ومقصود کیاہے؟ غیر مسلم تعلقات کے ساتھ اس کے تعلقات کی اصل شکل اور صحیح صورت کیاہوگی؟ عام طور پر دیکھاجائے تو تعلقات کی بنیادی طور پر دوہی صورتیں ہوتی ہیں: جنگ اور امن وصلح۔ اب اسلامی ممالک کا کفریہ ممالک کے ساتھ ان میں سے کس نوعیت کا تعلق اصل ہے اور کونسا تعلق عارضی رہے گا؟ زیر بحث موضوع سے متعلق ایک اہم سوال یہ دہرایاجاتاہے۔

اہل علم کا موقف

اس میں اہل علم کے درج ذیل دو مواقف نقل کئے جاتے ہیں:

۱: اس میں عام اہل علم کا موقف یہی نقل کیاجاتاہے کہ دونوں قسم کے ممالک میں اصل تعلق جنگ کا ہوگا، اسلامی مملکت اگر کسی کفریہ ملک کے ساتھ صلح کرناچاہتی ہے تو اجتماعی مصلحت کے لئے ایسا کرسکتی ہے تاہم یہ تعلق عارضی رہے گا۔

۲: ماضی قریب اور عصر حاضر کے بعض حضرات نے اس کے برعکس دونوں ممالک کے درمیان اصل تعلق صلح وامن کا قرار دیاہے، ماضی قریب کے اہل علم میں سے مصر کے

علامہ شیخ ابوزہرہ، شیخ عبد الوہاب خلاف، اور دکتور وہبۃ زحیلی صاحب رحمہم اللہ نے یہی موقف اپنایا ہے، پاک وہند میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اور ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب مرحوم کا بھی یہ موقف رہا ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر ان حضرات کا موقف انہی کے الفاظ وعبارات میں ذکر کیا جاتا ہے۔

شیخ ابوزہرۃ مرحوم نے اسلام کے بین الممالک تعلقات سے متعلق ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا، اس میں وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

ولاشك في أن الحرب في الاسلام ليست هي الأصل في العلاقات ،لأن المبادي التي قررناها في قواعد العلاقات لاتسمح بابتداء المسلمين بالحرب من غير باعث من هذه القواعد نفسها يبعث عليها:اما الإعتداء على العدالة أو الكرامة الإنسانية ،فلا تكون حرب إلا اذاكان من هذه القواعد ما يبررها ،فإن قامت فهذه القواعد تحكمها وتقيدها-وقبل أن نوضح أصل العلاقات الدولية في الاسلام،أهي الحرب أم السلم نشير بكلمة موجزة إلى ما كانت تسير عليه الدول عند ما نزل القرأن وبعث النبي ﷺ رسولا للعلمين -فأصل العلاقات الدولية في الاسلام هوالسلام،حتى يكون الاعتداء بالاعداء على الدولة الاسلامية فعلا أوبفتنة المسلمين عن دينهم- فالحرب حينئذ تكون ضرورة أوجبها قانون الدفاع عن النفس وعن العقيدة وعن الحرية الدينية.

ترجمہ: یقیناً اسلام میں جنگ بین الممالک تعلقات میں اصل نہیں ہے، اس لئے کہ ہم نے جو ابتدائی ضوابط علاقائی تعلقات کے لئے ذکر کئے ہیں جو مسلمانوں کو بلاوجہ جنگ

شروع کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ یا تو ظلم ہے یا انسانی عزت پر تجاوز کرنا ہے، لہذا جب تک یہ قواعد جنگ کی اجازت نہ دیں جنگ جائز نہیں ہو سکتا، اگر جنگ قائم ہو جائے تو یہ قواعد شرائط سمیت ان پر لاگوں ہوں گے۔ اسلام کے اندر ملکی تعلقات میں اصل جنگ ہے یا صلح ؟اس کو بیان کرنے سے پہلے اختصار کے ساتھ ہم نزول قران اور بعثت کے وقت کے ممالک میں رائج ضابطہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، پس اسلام میں ممالکی تعلقات میں اصل صلح ہے، یہاں تک اسلامی ملک پر عملا تجاوز کیا جائے یا مسلمانوں پر دین اسلام سے ہٹانے کے ذریعے تجاوز کیا جائے، پس اس صورت میں جنگ ایک ضرورت ہو گی جس کی اجازت جان سے، عقیدے سے، اور دینی آزادی سے دفاعی قانون دیتی ہے۔

شیخ عبد العزیز خلاف مرحوم سیاست سے متعلق اپنی ایک کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

واختلفوا في أساس العلاقة بين الدولة الإسلامية وغيرها، فقال فريق منهم: إن الإسلام يأمر بدعوة مخالفيه إلى أن يدينوا به وهذه الدعوة دعوتان دعوة باللسان ودعوة بالبنان. فمن دعوا باللسان وبلغوا هذا الدين على وجه صحيح يتبين به الحق ولم يجيبوا الدعوة وجب على المسلمين دعوتهم بالسيف وقتالهم...[1]

ترجمہ: اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ملک میں تعلقات کی بنیاد میں علمائے کرام کا اختلاف ہے: ایک گروہ کے نزدیک اسلام اپنے مخالفین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں، اور یہ دعوت دو قسم پر ہیں، زبان کے ذریعے دعوت اور ہاتھ کے

١ السياسة الشرعية الخارجية، علاقة الدولة الإسلامية بالدول غير الإسلامية، ص:٧٣۔

ذریعے، پس جن کو زبان کے ذریعے دعوت پہنچی اور یہ دین ان کو صحیح طریقے سے پہنچا یا گیا جس سے حق واضح ہوتا ہو اور اس کے باوجود وہ دعوت قبول نہ کریں تو مسلمانوں پر تلوار کے ذریعے ان کو دعوت دینا اور ان سے لڑنا ضروری ہے۔

اس کے بعد دوسرے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقال فريق آخر من العلماء: إن أساس علاقة الدولة الإسلامية بغيرها من الدول لا تغاير ما قرره علماء القانون الدولي أساسًا لعلاقات الدول الحاضرة. وإن الإسلام يجنح للسلم لا للحرب. وأنه لا يجيز قتل النفس لمجرد أنها تدين بغير الإسلام، ولا يبيح للمسلمين قتال مخالفيهم لمخالفتهم في الدين وإنما يأذن في قتالهم ويوجبه إذا اعتدوا على المسلمين، أو وقفوا عقبة في سبيل الدعوة الإسلامية ليحولوا دون بثها فحينئذ يجب القتال دفعًا للعدوان وحماية للدعوة حتى إذا لم يكن من المخالف في الدين عدوان لا على المسلمين ولا على دعوتهم فلا يحل قتاله، ولا تحرم معاملته ومبادلته المنافع. فلم يؤذن في القتال لأنه طريق الدعوة إلى الدين وإنما أذن فيه لحماية الدعوة من اعتداء المعتدين...[1]

ترجمہ:" بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ: اسلامی مملکت کا دوسرے غیر اسلامی ممالک سے تعلق کی بنیاد بین الاقوامی قانون کے ماہرین کے وضع کردہ بنیاد جو انہوں نے عصری ممالک کے لئے مقرر کیا ہے، سے مختلف نہیں، اور اسلام صلح کی طرف مائل ہے، جنگ کی طرف نہیں، اور اسلام صرف غیر مسلم ہونے کی وجہ سے قتل کی

[1] علاقة الدولة الإسلامية بالدول غير الإسلامية، ص:٧٩۔

اجازت نہیں دیتا، اور مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے مخالفین سے صرف کفر کی وجہ سے لڑیں، اسلام کافروں کے خلاف لڑنے کی صرف اس وقت اجازت دیتا ہے جب وہ کافر مسلمانوں پر ظلم کرنے لگے، اور یا اسلامی دعوت کی پھیلانے میں رکاوٹ بنیں، تو اس صورت میں ظلم دفع کرنے اور دعوت کی حمایت کرنے کی وجہ سے جہاد ضروری ہے، اس وجہ سے اگر دین کے مخالف سے کوئی ظلم مسلمانوں پر یا دعوت پر سرزد نہ ہو جائے تو اس کو قتل کرنا جائز نہیں، اور اس کے ساتھ معاملہ اور تبادلہ ناجائز نہیں، پس جنگ کی اجازت اس لئے نہیں دی گئی کہ یہ دعوت کا ذریعہ ہے بلکہ اس لئے دی گئی کہ ظالموں کے ظلم سے دعوت کو محفوظ کی جائے۔

ان دونوں مواقف، ان کے دلائل اور پھر دونوں میں فرق اور اس کے اثرات ونتائج ذکر کرنے کے بعد ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

والنظر الصحيح يؤيد أنصار السلم القائلين بأن الإسلام أسس علاقات المسلمين بغيرهم على المسالمة والأمان لا على الحرب والقتال إلا إذا أريدوا بسوء لفتنتهم عن دينهم أو صدهم عن دعوتهم فحينئذ يفرض عليهم الجهاد دفعًا للشر وحماية للدعوة وهذا بين في قوله تعالى في سورة الممتحنة المدنية [1]

ترجمہ: اور عقل سلیم بھی ان علمائے کرام کی تائید کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام نے کافروں سے تعلقات کی بنیاد صلح قرار دیا ہے نہ کہ جنگ اور لڑائی، سوائے اس صورت کے جب ان کو دین اسلام سے ہٹانے کی کوئی سازش کی جائے یا ان کو دعوت سے منع

[1] أيضا ،ص:٨٤۔

کیا جائیں تو اس صورت میں ان پر شر دفع کرنے اور دعوت کو محفوظ کرنے کی وجہ سے جہاد فرض ہے، اور یہ تفصیل سورۃ ممتحنہ میں موجود ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مجھے یاد نہیں کہ آیا میں نے اپنے کتاب میں صرف یہ جملہ لکھا ہے۔ جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں، اسلام نے جارحیت شروع کرنے کی اجازت نہیں دی صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ہے:

{ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ } [البقرة: ١٩٠]

یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے۔

"قاتلوا فی سبیل اللہ" کا مطلب ہے کہ اللہ تعالی کے لئے جنگ کرو، اپنی بڑائی، برتری یا کسی اور دنیاوی فائدے کے لئے اسے جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ باوجود جنگ شروع ہو جانے کے "تعدی اور تجاوز نہ کرو" بلکہ ایک ایسا برتاؤ ہو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ جب جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں، صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے تو پھر پر امن بقائے باہمی (peaceful co=existene) کے سلسلے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام خود یہی چاہتا ہے۔۔۔

اور جب اسلام خود امن پر زور دیتا ہے تو یہ کہنا کہ اسلام پر امن بقائے باہمی کے اصول کے خلاف ہے، میرے خیال میں درست نہیں ہو گا۔ باقی مجید خدوری کے اس بیان سے مجھے اتفاق نہیں کہ To fight the unbeliever wherever he is جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس وقت تک یہ بیان گمراہ کن ہو گا۔ البتہ یہ چیز صحیح ہے کہ اگر اعلان جنگ

ہو چکا ہے تو دشمن کے لوگ جہاں بھی ہوں ہمیں ان سے جنگ کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہمارے دشمن کو بھی حاصل ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہو گا۔"[1]

ڈاکٹر محمود غازی صاحب مرحوم کا جو سلسلہ خطبات "اسلام کا قانون بین الممالک" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر ملتا ہے، خاص کر نویں خطبے "اسلام میں غیر جانبداری کا تصور" تو خاص اس موضوع پر ہے اور اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ اسلامی ریاست کا غیر مسلم ممالک کے ساتھ اصل تعلق جنگ کا نہیں بلکہ امن و صلح کا ہے، جنگ کا تعلق صرف انہی ممالک کے ساتھ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ بر سرِ جنگ ہوں۔[2]

دونوں موقف کا تجزیہ

مکرر غور و خوض کے بعد اس ناکارہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اختلاف در اصل ایک اور اختلاف پر مبنی اور شاید اسی کا ثمرہ ہے، زیر بحث مسئلہ میں اختلاف کی بڑی بنیاد مسئلہ جہاد اور اس کا شرعی تصور و مفہوم ہے، اسلام نے مسلمانوں کو جو جہاد کرنے کا حکم دیا ہے، اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ کیا مسلمان صرف دفاعی طور پر ہی جہاد کرنے کے پابند ہیں یا اقدامی جہاد کا بھی ان کو حکم ہے؟ دفاعی جہاد کا مطلب عام طور پر یہی لیا جاتا ہے کہ کوئی غیر مسلم ملک / طاقت مسلمان ملک پر عملی طور پر حملہ آور ہو جائے یا عزم کر کے اس کی تیاری کر لے تو مسلمان ملک ان کے حملے کا جواب دے یا ان کے خلاف چڑھائی کرے۔

---

[1] خطبات بہاولپور، ص ۱۴۶۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں، درج بالا خطبہ، ص ۴۰۳ سے ۴۳۳ تک۔

اس مفہوم کے مطابق[1] اگر دین اسلام اپنے ماننے والوں کو صرف دفاعی جہاد ہی کا حکم دیتا ہے اور اقدامی جہاد ان کے لئے درست نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا دوسرا مطلب ہی یہی نکلے گا کہ جو ممالک مسلمانوں کے ساتھ عملی طور پر برسرِ پیکار ہوں اور نہ اس کا عزم وارادہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کا تعلق نہ رکھا جائے بلکہ ایسے ملک کے ساتھ باہمی امن وسلامتی کا رشتہ ہی استوار رہے گا اور اگر مسلمان صرف اسی جہاد کے مخاطب نہ ہوں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اقدامی جہاد کا بھی ان کو حکم ہو تو ظاہر ہے کہ دیگر ممالک کے ساتھ ان کا اصل تعلق صلح کا نہیں ہو گا۔

اب رہا یہ سوال کہ جہاد کے حکم کی حیثیت کیا ہے؟ کیا مسلمان صرف دفاعی جہاد ہی کے مکلف ہیں یا ان کو اقدامی جہاد کرنے کا بھی حکم ہے؟ اس میں چند ایک شاذ اقوال سے ہٹ کر جمہور اہل علم کا موقف ہمیشہ سے یہ رہا ہے[2] کہ جہاد صرف دفاع ہی کے لئے مشروع نہیں ہوا

---

[1] یہ، اور اس کے ہم معنی قیودات بڑھانے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ اس ناکارہ کے خیال میں "دفاعی" اور "اقدامی" کے یہ عنوانات واصطلاحات ہی علمی دقّت کے معیار پر پورے نہیں اترتے، "دفاعی" میں کس چیز کا دفاع مقصود ہے؟ اس وقت دنیا میں قومی ریاستوں کا راج ورواج ہے تو کیا اس وقت جو مسلمان ریاستیں کہلاتی ہیں، ان ریاستوں کا دفاع کرنا مقصود ہے یا دین کا دفاع کرنا پیش نظر ہے؟ پھر دین کے دفاع کا دائرہ کار کیا ہے؟ کن لوگوں کے دین کا دفاع مراد ہے؟ اور کس چیز سے دفاع مطلوب ہے؟

[2] ان آخری دو تین صدیوں میں مسلمانوں کی معروضی حالات کا نتیجہ ہے کہ بہت سے ارباب فکر اور اہل علم کے ہاں اس غلط نظریہ کو قبولیت حاصل ہوئی، عجم اور خاص کر برصغیر پاک وہند کے مخصوص حالات وخصوصیات کی وجہ سے یہاں تو اس نظریہ کو زیادہ فروغ نہیں ملا، لیکن عالم عرب میں اس کو بہت فروغ ملا، دکتور عثمان جمعہ ضمیریہ نے اپنی مفید وضخیم کتاب "اصول العلاقات الدولیۃ" میں اس سلسلے میں درج ذیل حضرات کے نام لکھے ہیں جن کا یہ موقف تھا: شیخ عبد العزیز خلاف، شیخ ابو زہرۃ، شیخ محمد عبد اللہ دراز، شیخ عبد الرحمن عزام، محامی علی علی منصور، دکتور حامد سلطان، دکتور محمد طلعت غنیمی، دکتور صبحی محمصانی، شیخ ظافر قاسمی۔ (اصول العلاقات الدولیۃ، ص ۹۷۳)

بلکہ اگر مسلمان استطاعت رکھتے ہوں تو ان کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ دین اسلام کے اس حکم اور پیغام کو عام کریں، کفر یہ افراد و ممالک تک بھی اس امانت کو اپنی صحیح شکل وصورت میں پہنچائیں، کوئی اس پیغام کو دل سے قبول کرتا ہے تو درست، ورنہ جو اس سے انکار کرنے پر اصرار کریں، ان کو اسلامی نظام کے ماتحت رہ کر زندگی گزارنے کا اختیار دیا جائے، اگر کوئی اس سے بھی انکار کرتا ہے تو اس کے ساتھ مسلمانوں کو اقدامی جہاد کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام

اس تفصیل کے مطابق اسلامی حکومت کا غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ اصل ربط و تعلق نہ بہر حال جنگ کا ہے اور نہ صلح وامن کا ہے بلکہ اصل تعلق دعوت دینے اور اسلامی پیغام پہنچانے کا ہے، اگر کوئی ملک اس سے بہر صورت اعراض کرتا ہے تو اگر استطاعت ہو تو ان کے ساتھ جہاد کرنا ضروری ہے۔

باب سوم: عالمی اداروں کے ساتھ تعلقات

اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنے کا مسئلہ

عالمی اداروں کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم

عالمی اداروں سے تعاون لینے کا حکم

باب سوم: عالمی اداروں کے ساتھ تعلقات

اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کرنے کا مسئلہ

کسی بھی ادارے میں رکنیت اختیار کرنا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جبکہ:

الف: اس ادارے کے مقاصد واہداف شرعی نقطہ نظر سے جائز ہوں، ان میں کوئی ناجائز ہدف شامل نہ ہو۔

ب: طریقہ کار بھی درست ہو، یعنی رکن بننے اور پھر مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے کا عملی نہج بھی شرعی تعلیمات کے مطابق ہو۔

اگر مقصود ناجائز ہو یا مقصود تو ناجائز نہ ہو لیکن اس کا عملی طریق کار جائز نہ ہو تو دونوں صورتوں میں ایسے ادارے میں رکنیت اختیار کرنا درست نہیں ہو گا۔

اس ضابطہ کی روشنی میں جب "اقوام متحدہ" میں رکنیت اختیار کرنے کے مسئلے پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک مسلمان ملک وریاست کے لئے اس میں اپنے اختیار سے شامل ہونا شرعاً درست نہیں ہے جس کی ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ رکنیت اختیار کرنے کے لئے "اقوام متحدہ" کے مرتب کردہ "انسانی حقوق" کے منشور کی تائید وتصدیق کرنی ضروری ہے اور یہ منشور دین اسلام کے دسیوں احکام ونصوص سے متصادم ہے۔

عالمی اداروں کے ساتھ تعاون کرنے کا حکم

دنیا میں اس وقت متعدد ادارے ہیں جو مختلف میدانوں میں امداد وتعاون کی بنیاد پر قائم کئے گئے ہیں، ان میں سے بعض ادارے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے یا ان کی ماتحتی میں

اپنی خدمات انجام دیتے ہیں، بعض کسی خاص ملک یا چند ممالک کے تعاون سے ایسا کرتے ہیں جبکہ بعض یوں ہی مختلف خدمات انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان اداروں کے ساتھ مالی تعاون کرنے کا کیا حکم ہے؟ اس کا دارومدار ان کے اہداف ومقاصد پر ہے، اہداف ومقاصد مباح ہوں تو تعاون کرنا بھی درست، اہداف مستحسن ومندوب ہوں تو تعاون کا بھی یہی حکم ہوگا اور اہداف ومقاصد ناجائز ہوں تو ان کے ساتھ تعاون کرنے کا بھی یہی حکم ہوگا۔ ناجائز اہداف ومقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متعلقہ ادارے ان ممالک کے ساتھ تعاون کریں جو دنیا کے کسی بھی خطہ میں مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوں یا مسلمانوں سے ان کی سرزمین چھین کر ان پر قابض وحاکم ہوں، کیونکہ ایسے ممالک تمام مسلمانوں کے لئے محارب کی حیثیت رکھتے ہیں اور محارب کے ساتھ اس نوعیت کے تعلقات رکھنا ممنوع ومذموم ہے۔

اس حد تک تو بات صاف ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس پہلو کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ:

الف: یہ دور پروپیگنڈوں کا دور ہے، جس میں ممالک اور ادارے تو درکنار، معاشرے کے عام افراد کا بھی یہ حال ہے کہ صداقت، صاف گوئی، راست بازی اور صاف سیدھے الفاظ میں حقیقی مراد ومقصود بتانے کا رواج کمیاب ہوتا جارہا ہے، اس لئے اس دور میں کسی ادارے کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے صرف زبانی خوشنما الفاظ یا تحریری طور پر چند کلمات ہی کو بنیاد بنانا دانش مندی کے سراسر خلاف ہے، اسی طرح رائے عامہ کو ہموار کرنے اور تبدیل کرنے کے بھی نت نئے طریقے / حربے اختیار کئے جاتے ہیں، اس لئے لوگوں کی تعریف وتوصیف یا تنقید وتردید پر بھی زیادہ اعتماد کرنا مضر ہے۔

ب: شخصی طور پر تعاون کرنا اور ملکی وریاستی سطح پر تعاون کرنا یکساں نہیں، بلکہ دونوں میں فرق ہے، شرعی نقطہ نظر سے بھی دونوں کا حکم ایک جیسا نہیں ہے، دونوں میں نمایاں فرق یہی ہے کہ ہر شخص اپنے مال وخدمات کے استعمال میں خود مختار ہے، کسی بھی جائز

مصرف میں اس کو خرچ کر سکتا ہے، لیکن ملکی اور ریاستی املاک وخدمات کا یہ حکم نہیں، وہ ارباب حکومت کی شخصی ملکیت نہیں ہوتی جس میں اپنی مرضی کا کوئی بھی تصرف کر سکے بلکہ ان چیزوں کی حیثیت امانت کی اور ارباب اقتدار کی حیثیت متولی کی سی ہوتی ہے، اس لئے اس بات پر اتفاق ہے کہ حکام سرکاری املاک وخدمات میں مبنی بر مصلحت اقدام ہی کرنے کے مُجاز ہیں، ریاستی اور عوامی مصلحت کی بجائے ذاتی مصالح کے لئے ایسے امور کا استعمال کرنا کھلی خیانت اور سخت مذموم ہے۔

عالمی اداروں سے تعاون لینے کا حکم

اس وقت بہت سے اسلامی ممالک ایسے ہیں جن کی اقتصادی حالت اور معاشی حیثیت کچھ زیادہ مستحکم نہیں ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے نظامِ مملکت چلانے کے لئے عالمی نوعیت رکھنے والے مختلف اداروں سے مختلف شعبوں میں مدد لیتے ہیں، خود ہمارے وطن عزیز پاکستان کا بھی یہی حال ہے۔ اس طرح مدد لینا اور تعاون وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر اس میں درج ذیل دو باتوں کی پابندی کی جائے تو گنجائش ہے ورنہ نہیں:

الف: مدد وصول کرنے میں کسی منکر / معصیت کے ارتکاب کی نوبت نہ آئے۔ مثال کے طور پر اس وقت دسیوں اسلامی ممالک "آئی ایم ایف" کے مقروض ہیں، یہ ادارہ ان ممالک کو قرض فراہم کرتا ہے جو تعاون ہی کی ایک صورت ہے، تاہم یہ تعاون مفت میں نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا عوض واپس کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی جوں کا توں نہیں بلکہ مقررہ اضافوں سمیت، جو شرعی نقطہ نظر سے "سود" کی واضح شکل ہے جہاں مسلمان کسی ایسے فریق کو سود دینے کا عہد والتزام کرتا ہے جو مسلمان نہیں ہے، اس لئے ایسا تعاون وصول کرنا بالکل ناجائز اور ممنوع ہے۔

ب: مدد وصول کرنے اور تعاون لینے کے نتیجے میں یہ اندیشہ نہ ہو کہ اسلامی ملک / حکومت / افراد متعلقہ اداروں کے ناجائز مطالبات ماننے پر مجبور ہوں گے، چاہے وہ مجبور

ہونا فوری ہو یا کچھ عرصہ کے بعد۔ جہاں اس طرح مجبوری پیدا ہو جانے کا یقین یا غالب گمان ہو، وہاں تعاون وصول کرنا جائز نہیں۔

عالمی اداروں اور این جی اوز سے تعاون لینے میں یہ شرط غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس وقت بہت سے ادارے اور ممالک کے تعاون کرنے کے پسِ منظر یا پیشِ منظر میں یہی بات چھپی ہوتی ہے، تجربہ کار لوگوں کا تجزیہ یہ ہے کہ ملکی سطح پر تعاون کرنے کی صورتیں عام طور پر پالیسی ساز ہی ہوتی ہیں، وہ مفت میں کسی ملک کے ساتھ تعاون ہوتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ان کے ہاں کوئی قابلِ التفات چیز ہے، وہ اگر کسی ملک کے تعاون میں دلچسپی لے کر ان پر اپنے خزانے نچھاور کرتے ہیں تو اسی جذبے کے ساتھ کہ اس دوستی و تعاون کے بدلے وہ اپنے بلند تر اہداف و مقاصد حاصل کر سکیں۔ بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ تھوڑے تعاون اور معمولی امداد کے سہارے بڑے مقاصد اور غیر معمولی اہداف تک رسائی حاصل ہوئی۔

اس سلسلے میں دور جائے بغیر صرف "آئی ایم ایف" کے طریقہ کار، ماضی و حال کا جائزہ لیا جائے تو صورت حال بالکل نکھر کر سامنے آسکتی ہے، یہ ادارہ آڑے وقت میں ترقی پذیر ممالک کو قرض فراہم کرتا ہے، قرض کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ مفت اور بلا عوض نہیں ہے بلکہ انجام کار اس جتنی رقم واپس کرنی ہوتی ہے، پھر قرض بھی قرض حسنہ نہیں ہوتا کہ جتنی رقم قرض کے طور پر وصول کرلی، اتنی ہی رقم واپس کر دی جائے بلکہ سودی قرض ہوتا ہے جس میں اصل رقم کے ساتھ متعینہ مقدار میں سود دینا بھی ضروری ہوتا ہے، لیکن یہ سودی قرضہ بھی یوں فراہم نہیں ہوتا بلکہ اس میں پالیسی ساز شرائط کو منوالیا جاتا ہے، پسماندہ اور ضرورت مند ملک جب قرض وصول کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو اس کو مختلف شرائط پر سودی قرضہ دیا جاتا ہے، وہ شرائط بھی ایسی ہوتی ہیں جن سے ملکی پالیسی تبدیل ہو جاتی ہے اور انجام کار ملکی یا عوامی نقصان ہوتا ہے۔

ناکارہ عبید الرحمن عفی عنہ، مردان۔ ۵ جمادی الاخریٰ ۴۵ھ

مراجع ومصادر

١. صحيح مسلم، المؤلف: مسلم بن الحجاج النيسابوري (المتوفى:٢٦١ھ-)
٢. شرح النووي علي صحيح مسلم، المؤلف: محيي الدين يحيى بن شرف النووي (المتوفى:٦٧٦ھ-)
٣. عمدة القاري، المؤلف: علامہ بدر الدین العینی رحمہ اللہ (المتوفى:٨٥٥ھ-)
٤. مقالات الاسلاميين، المؤلف: أبو الحسن علي بن إسماعيل (المتوفى:٣٢٤ھ-)
٥. مراتب الإجماع، المؤلف: أبو محمد علي بن أحمد القرطبي (المتوفى:٤٥٦ھ-)
٦. الجامع لاحكام القرن للقرطبي، المؤلف: أبو عبد الله محمد بن أحمد القرطبي (المتوفى: ٦٧١ھ-)
٧. السنن الكبري للبيهقي، المؤلف: أحمد بن الحسين البيهقي (المتوفى:٤٥٨ھ-)
٨. الفقه الإسلامي وأدلته للزحيلي، المؤلف: أ. د. وَهْبَة بن مصطفى الزُّحَيْلِيّ
٩. أحكام القرآن للجصاص ت قمحاوي ، المؤلف: أحمد بن علي أبو بكر الرازي الجصاص (المتوفى:٣٧٠ھ-)
١٠. اسلام اور غیر مسلم تعلقات، حضرت مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ
١١. السياسة الشرعية الخارجية، شیخ عبد العزیز خلاف رحمہ اللہ
١٢. خطبات بہاولپور، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب
١٣. اصول العلاقات الدولية، أ. د. عثمان جمعہ ضمیریہ